Fikr-o-Nasar vol.1: 7-8 (1964)

سُنّت اور حدیث

ڈاکٹر فضل الرحمٰن

(حدیث پر سلسلۂ مقالات کی یہ پانچویں، آخری اور اہم ترین قسط ہے)

اس سلسلے کے پچھلے مقالوں میں ہم نے حدیث کے بعض اہم اور نمایاں پہلوؤں کا غیر جذباتی معروضی تجزیہ پیش کیا ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ بعض نسبتاً غالی قسم کے روایت پسند اصحاب کو ہمارا یہ تجزیہ کسی قدر بے رحمانہ، بلکہ ساتھ ہی غیر منصفانہ بھی نظر آیا ہوگا لیکن جذبات کی رو میں بہنے سے بات نہیں بنے گی ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آخر پچھلے مقالوں کی اس ساری بحث سے نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ اس بارے میں ہمارے ذہنوں کو بالکل صاف ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ترقی پسندی کے نام پر حدیث اور سنت نبوی کو مکمل طور پر مسترد کر دینے کے قوی رجحانات ہمارے معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔ ترقی پسندی کے ان نادان دوستوں نے کہیں سے یہ سن لیا ہے کہ ؎

ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند اول آں بنیاد را ویراں کنند

اب یہ اصحاب ملتِ مسلمہ کی تعمیر نو کے لئے اسلام کی تخریب کے درپے ہیں! نہ صرف یہ اصحاب مآل اندیشی کی صفت سے یکسر معرّا ہیں بلکہ مسائل زیر بحث کی نسبت ان کے نقطۂ نظر میں ایک شدید قسم کا الجھاؤ پایا جاتا ہے۔ اور خود حدیث کے ارتقاء کے متعلق افسوسناک حد تک ان کی لاعلمی نظر نواز ہے احادیث کے بارے میں نہ تو یہ علم رکھتے ہیں نہ بصیرت، اس کے باوجود کبھی تو یہ کہتے ہیں کہ احادیث تاریخی صداقت سے محروم ہیں۔ اِس لئے سنتِ نبوی کی شاہد ہونے کی حیثیت سے

کے

غیر معتبر ہیں۔ کبھی یہی اصحاب یہ کہتے ہیں کہ احادیث کی تاریخی صداقت مان بھی لی جائے تب بھی ان کی شرعی حجیت تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ یعنی احادیث اگر صحیح بھی ہیں تب بھی وہ ہمارے لئے سنت نہیں بن سکتیں۔

ترقی ہم سب کو عزیز ہے لیکن ایسی ترقی کس کام کی، جو اسلام کے برعکس یا اس سے قطع نظر کر کے ہو۔؟ ہماری ترقی کو تابع اسلام ہونا ہے کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل جس شریعتِ حقہ کی دعوت عرب کے جزیرہ نما میں دی گئی تھی وہ خود سراسر مادی و روحانی ترقی کی تحریک تھی۔ ہم نہ نام نہاد ترقی پسندوں کے ذہنی الجھاؤ کے روادار ہیں نہ ان کے مخالفوں کے ذہنی جمود کے۔ ترقی کی منزلِ آخری کیا ہے؟ اس کی راہ کے مراحل کیا ہیں؟ یہ راہ شروع کہاں سے ہوتی ہے؟ ان سوالات کے جواب حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنی تاریخ کا سنجیدہ اور تعمیری تجزیہ کرنا ہے۔

ترقی اور ترقی پسندی کے بارے میں یہ چند جملہ ہائے معترضہ تھے جن کا پیش کرنا ہمارے اپنے موقف کی وضاحت کے لئے ضروری تھا۔ اب آئیے موضوعِ زیرِ بحث کی طرف لوٹتے ہوئے ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ سنت اور حدیث کے مابین حقیقی رشتہ کیا ہے؟ کیونکہ ہمارے مسئلہ کی جان اسی سوال کے جواب میں مضمر ہے۔ مگر اس سوال کے حل کے لئے حدیث کی مخالفت اور حمایت میں پچھلے چند سال کے عرصے میں جو تودہ طومار کھڑا کیا گیا ہے ان سب کا جائزہ لے جائیے، آپ کو اس بنیادی سوال کا حل تو الگ رہا، کہیں اس کا ذکر تک نظر نہیں آئے گا۔ کیونکہ یہ ساری بحث حدیث و سنت کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھ کر کی گئی ہے۔ حالانکہ اگر اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کا کوئی گروہ ایسا نہیں تھا جو سنت کا منکر رہا ہو۔ یہاں تک کہ خوارج اور معتزلہ بھی اس کے قائل تھے۔ البتہ سنت نے حدیث کی شکل میں جو صورت اختیار کی تھی اس پر انہیں ضرور اعتراض تھا۔[۱]

حدیث کی مخالفت میں، اور چونکہ ان کے نزدیک حدیث و سنت مترادف ہیں۔ اس لئے حدیث و سنت دونوں کی مخالفت میں، جو دلیل دی جاتی ہے وہ اکثر خود احادیث کے ذخیرہ ہی سے حاصل کی جاتی ہیں۔ یعنی ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

کہا یہ جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے بلکہ خود حضرت رسالتمآبؐ نے حدیثیں روایت کرنے سے منع فرمایا تھا۔ ہم اسے ماننے کے لئے تیار نہیں کیونکہ اولاً یہ حدیث عقل کی رو سے باطل ہے۔ ثانیاً تاریخی تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اور اسی قسم کی دوسری مخالف حدیث حدیثیں خود تحریکِ حدیث کے ارتقا کا بلا واسطہ نتیجہ ہیں۔ (جیسا کہ ہم اپنے پچھلے مقالے بہ عنوان "تحریک حدیث" میں واضح کر چکے ہیں) حدیث کی مخالفت میں ان دنوں جو تحریک چل رہی ہے، ہم اس کے سراسر مخالف ہیں۔ کیونکہ اگر ہم نے تمام احادیث سے انکار کر دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک کے ساڑھے تیرہ سو سال کے زمانی بُعد کی یہ وسیع خلیج کیونکر عبور ہو گی؟ احادیث کے بغیر جو بھیانک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں قرآن حکیم بھی ہمارے ہاتھوں سے ضائع ہو جاتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا فعل ہی ہے جو خدا کے قول کے معانی کو متعین کرتا ہے۔ احادیث کے بغیر جس کا جو جی میں آئے قرآن کو معنی پہنا سکتا ہے۔ احادیث کے انکار سے خود قرآن کا وجود اور اس کی صحت، بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا وجود ایک داستان بن کر رہ جاتا ہے۔

احادیث کے بارے میں اپنی تحقیق کے نتائج کا خلاصہ پیش کرنے سے پہلے ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ:۔ اوّلاً تاریخ و سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق احادیث اور فقہی و کلامی مسائل پر مشتمل احادیث میں تمیز قائم کرنا بے حد ضروری ہے۔ ثانیاً اول الذکر قسم کی احادیث کی مجموعی صحت شبہات سے بالاتر ہے۔ ثالثاً ثانی الذکر قسم کی احادیث میں سے اکثر و بیشتر کی صحت اگرچہ مشکوک ہے لیکن ایک بنیادی مفہوم میں ان کی بھی حجیّت کا قائل ہونا پڑے گا۔ ہم مثالوں کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ بنیادی مفہوم کیا ہے جس کے لحاظ سے ہم فقہی و کلامی قسم کی احادیث کی حجیّت کے قائل ہیں۔ اس بارے میں ہم مندرجہ ذیل تنقیحات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

تنقیح اول:۔ ہم نے پچھلے مقالات میں مختلف مثالوں سے یہ واضح کر دیا ہے کہ فقہی و کلامی قسم کی احادیث میں سے اکثر و بیشتر اپنی موجودہ شکل میں تاریخی طور پر غیر صحیح ہیں۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ احادیث کے وسیع ذخیرے میں سے ہم نے چند حدیثیں چن لیں اور ان کی بنا پر ہم نے من مانے نتائج اخذ کر لئے ہیں۔ ہم جواباً یہ عرض کرنے کی اجازت چاہیں گے کہ اولاً ہم نے

جو مثالیں پیش کی ہیں وہ ان احادیث کی ہیں جنھیں ہم "اصولی" کہہ سکتے ہیں۔ یعنی یہ وہ احادیث ہیں جن پر معبادیات دین کی ساری عمارت کی بنیاد قائم ہے (اصطلاح "اصولی حدیث" کی مزید توضیح کے لئے ملاحظہ ہو ہمارا مقالہ بعنوان "تحریک حدیث") اگر اجماع اور حدیث جیسے بنیادی اصولوں کے بارے میں احادیث تاریخی طور پر غیر صحیح ثابت ہو جائیں تو دوسری بیشتر احادیث کی صحت یقیناً معرض خطر میں پڑ جاتی ہے۔ یہاں یہ امر خاص طور پر لائق توجہ ہے کہ ہم نے لفظ "بیشتر" استعمال کیا ہے دیا اس سے پہلے اسی مفہوم میں ہم نے عرض کیا تھا "اکثر و بیشتر احادیث") ہم نے تمام احادیث کی صحت پر شک نہیں کیا ہے۔ بیشتر اور تمام کا یہ فرق اہم ہے، لیکن صرف نظریاتی حیثیت سے اور فی الحال ہمارے پاس ایسے وسائل نہیں ہیں جن سے ہم اس فرق کو متعین اور منتقل کر سکیں۔ ہمیں اب تو ہر حدیث کو فرداً فرداً جانچنا اور تاریخی لحاظ سے اس کی صحت کو پرکھنا ہوگا۔

ہم پر دوسرا اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے اسناد کو نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ یہ اسناد ہی ہیں جو احادیث کی صحت کی ضمانت ہیں۔ واضح رہے کہ ہم اسناد کی اہمیت کے پورے طور پر قائل ہیں اسناد ہی کی وجہ سے جیسے اور صحیح سوانحی معلومات کا وہ عظیم الشان ذخیرہ جمع ہوا ہے جو اسماء الرجال کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ اور مسلمانوں کا عدیم المثال کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ اسناد ہی کی بدولت ہے کہ احادیث میں جعلسازی کا خطرہ کم سے کم ہو گیا۔ یقیناً ہمارے محدثین کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے ان کی انتھک محنتوں کے ثمرے میں موضوع احادیث کی ایک کثیر تعداد چھٹ گئی ہے۔ اور یہ صفائی اسناد ہی کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ غرض اسناد کی یہ منفی حیثیت مسلّم ہے۔ لیکن اسے مثبت قطعی حجت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مانا کہ زید ایک ثقہ راوی ہے اور بکر بھی۔ یہ بھی تسلیم کہ زید کی بکر سے ملاقات ہوئی تھی (گرچہ ملاقات کا تعین کافی دشوار ہے) لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ زید نے بکر سے فلاں حدیث ضرور ہی روایت کی تھی؟ اسناد کے مثبت قطعی حجت ہونے کے خلاف سب سے قوی اور قاطع دلیل یہ ہے کہ خود اسناد کا استعمال پہلی صدی ہجری کے اختتام سے شروع ہوا۔ نتیجہ یہ ہے کہ مثال کے طور پر بخاری اور مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آنیوالے سیاسی انتشار کے متعلق پیشین گوئی والی حدیثوں کے اسناد خواہ کیسے ہی قوی کیوں نہ ہوں ہم ان کی صحت کو قبول نہیں کر سکتے کیونکہ ان احادیث کی اپنی داخلی شہادتیں اس کے خلاف ہیں۔

تنقیح دوم:- احادیث کی تاریخی عدم صحت کے بارے میں ہمارے نظریے پر سب سے زیادہ بنیادی اعتراض علمی نہیں، بلکہ جذباتی ہے، یقینی نہیں، بلکہ ظنّی ہے۔ یعنی یہ کہ اگر ہمارا نظریہ تسلیم کر لیا جائے، تو تحریکِ حدیث ایک بہت بڑی سازش قرار پائیگی۔ لیکن اس شبہے کو دور کرنے کے لئے پہلے تو ہمیں، یہ دیکھنا چاہیئے کہ محدثین خود اپنی مساعی کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ کیا وہ تمام صحیح کہلانے والی احادیثِ مرفوع کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے تاریخی صحت کے ساتھ مروی ہونے کے قائل تھے؟ ان سوالات کا جواب دیتے وقت ہمیں مندرجہ ذیل روایات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

(۱) سننِ ابنِ ماجہ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک حدیث ہے جس کا ایک حصّہ ہم اپنے پچھلے مقالے بعنوان "تصورِ سنّت پر تفصیلی بحث" میں نقل کر چکے ہیں۔ پوری حدیث درج ذیل ہے:-

حدثنا علی بن المنذر ثنا محمد بن فضیل ثنا المقبری عن جده عن ابی هریرة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه قال لا اعرفن ما یحدث احدکم عنی الحدیث وهو متکیٔ فی اریکته فیقول اقرأ قرآناً ما قیل من قول حسن فانا قلته۔	"روایت کی ہم سے علی بن المنذر نے، انھوں نے محمد بن فضیل سے، انھوں نے مقبری سے، انھوں نے اپنے دادا سے، انھوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے ہرگز یہ تک نہیں پہنچنا چاہیئے کہ تم میں کسی شخص کو میری حدیث بیان کی جائے اور وہ اپنی گدی پر تکیہ لگائے بیٹھا ہوا یہ کہے کہ مجھے تو قرآن کا کوئی ٹکڑا سناؤ۔ جو بھی اچھی بات کہی گئی، تو جانو کہ وہ میں نے ہی کہا ہے"۔
(سنن ابن ماجہ، باب اتباع السنّة)۔	

اس حدیث کا خط کشیدہ ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے

ہم عصر محدث امام احمد بن عمرو البزارؒ کے مسندوں میں ان ہی حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے مگر دوسرے طریق سے یہی حدیث زیادہ تفصیل کے ساتھ مروی ہے، اس میں مندرجہ بالا ٹکڑے کی جگہ یہ الفاظ ہیں :۔

ماجاءکم عنّی من خیر قلتہ او لم اقلہ فانا اقولہ وما اتاکم من شرّ فانی لا اقول الشرّ	"تم تک جو بھلی بات میرے حوالے سے پہنچے تو سمجھو کہ میں نے ہی کہی ہے۔ خواہ میں نے (فی الواقع) کہی ہو یا نہ کہی ہو اور اگر بُری بات پہنچے، تو جان لو کہ میں بری بات نہیں کہتا۔"

موخر الذکر اسناد میں ایک راوی ابو معشر نجیح کے بارے میں اسماء الرجال کے ماہروں کا اختلاف ہے لیکن اس حدیث کی تائید مزید حضرت ابو سعیدؓ (یا ابو حمیدؓ) سے مروی اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابو یعلیٰؒ نے اپنے اپنے مسندوں میں روایت کیا ہے۔ اور اسے امام سیوطیؒ نے حدیث صحیح قرار دیا ہے۔ اس کا متن یوں ہے۔

اذا سمعتم الحدیث عنّی تعرفہ قلوبکم وتلین لہ اشعارکم وابشارکم وترون انہ منکم قریب فانا اولاکم بہ واذا سمعتم الحدیث عنّی تنکرہ قلوبکم وتنفر منہ اشعارکم وابشارکم وترون انہ بعید منکم فانا ابعدکم منہ	"اگر تم میری کوئی حدیث سنو اور وہ تمہارے دل کو لگتی ہو، اس سے تمہارے احساسات اور چہرے بُشرے میں نرمی پیدا ہوتی ہو اور تم اپنے آپ کو ادھر کھنچا پاؤ تو جانو کہ اس حدیث سے دلنسبت کے لئے، میں تم سے زیادہ حقدار ہوں اور اگر تم میری کوئی ایسی حدیث سنو جو تمہارے دل کو نہ لگتی ہو اور اس سے تمہارے احساسات اور چہرے بُشرے میں نفرت کا اظہار ہو اور تم اس سے

اپنے آپ کو ہٹتا ہوا پاؤ، تو جانو کہ اس
حدیث سے میں تمہاری نسبت زیادہ دور ہوں"

(۲) وضع حدیث کے خلاف سب سے مضبوط رکاوٹ وہ مشہور حدیث تھی جو بالتواتر مروی ہے اور جس کے الفاظ یہ ہیں :-

من کذب علی متعمداً فلیتبوا مقعدہ من النار	جس نے جان بوجھ کر مجھ پر بہتان باندھا، اس نے جہنم میں اپنا ٹھکانا بنایا"

اس حدیث کے الفاظ میں بعد میں ترمیم کر کے الفاظ لیضل بہ کا معنی خیز اضافہ کیا گیا۔ یعنی یہ کہ "جس نے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے جان بوجھ کر مجھ پر بہتان باندھا، اس نے جہنم میں اپنا ٹھکانا بنایا۔"

امام طحاوی (متوفی ۳۲۱ھ) نے اپنی مفید کتاب مشکل الآثار میں تفصیل کے ساتھ ان مختلف اسنادوں پر بحث کی ہے جن سے یہ ترمیم شدہ حدیث مروی ہے اور ان کی صحت پر شک کیا ہے[۵]۔ لیکن ہمیں یہاں بحث اس حدیث کی صحت یا عدم صحت سے نہیں۔ بلکہ اس امر سے ہے کہ وہ اصحاب حدیث کے ایک خاص رجحان کی ترجمان ہے۔ چنانچہ ہمارے قیاس کی تائید امام نووی شارح صحیح مسلم (متوفی ۶۷۶ھ) کے اس قول سے ہوتی ہے کہ اسی روایت کی بنیاد پر یہ عام اصول بنا لیا گیا کہ انہ یجوز وضع الحدیث فی الترغیب والترھیب یعنی "ترغیب و ترہیب کے مضامین کی (پرہیزگاری کے جذبات پیدا کرنے والی) حدیثیں وضع کرنا جائز ہے۔ امام نووی نے یہ اصول کرّامیہ کی طرف منسوب کیا ہے اور ان کا یہ کہنا ہے کہ بہت سے جاہلوں اور واعظوں نے اس اصول کی پیروی کی ہے[۶]۔ لیکن اگر امام غزالی کی احیاء علوم الدین جیسی کتابیں پیش نظر ہوں تو اس "اصول" کے اتباع کو جاہلوں اور واعظوں تک منحصر کرنا دشوار ہوگا۔

(۳) یہی امام نووی راوی ہیں کہ بعض حضرات نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ

مندرجہ بالا مشہور و متواتر حدیث میں الفاظ "کذب علیّ" ہیں۔ حرف جار "علیٰ" کے صلہ سے مفہوم "مخالفت" "نقصان" وغیرہ کا نکلتا ہے۔ اور پرہیزگاری و دینداری کے لئے حدیثیں بنانے میں "موافقت" اور "نفع" کا پہلو ہے۔ اس لئے ایسی حدیثیں وضع کرنے پر حدیثِ مذکورہ بالا کی "جہنم میں ٹھکانا بنانے" کی وعید کا اطلاق نہیں ہوگا۔ امام نوویؒ کے اپنے بلیغ الفاظ یہ ہیں:۔

"انّ ھذا کذبٌ لہٗ صلی اللہ علیہ وسلم لا علیہ" ۔

(۴) سننِ دارمی میں متواتر حدیثِ مذکورہ بالا کی جو تشریح حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب ہے اس سے (بالخصوص اس کے خط کشیدہ فقرہ سے) بھی متبادر ہوتا ہے کہ عام امّت (الناس) کے نزدیک جو امر مستحسن ہو اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا صرف کرامیہ کا مسلک نہیں تھا۔ حدیث درج ذیل ہے:۔

اخبرنا ابو معمر اسماعیل بن	"خبر دی ہمیں ابو معمر اسماعیل
ابراھیم عن صالح بن عمر	بن ابراہیم نے، انھیں صالح بن عمر نے
عن عاصم عن کلیب عن ابیہ	انھیں عاصم نے، انھیں کلیب نے،
عن ابی ھریرۃ قال کان	انھیں ان کے والد نے، کہ حضرت
اذا حدّث عن رسول اللہ	ابو ہریرہؓ جب کبھی رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم من کذب	صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت
علیّ متعمّدا فلیتبوّأ مقعدہ	کرتے تو یہ کہتے کہ فرمایا رسول اللہ
من النار فکان ابن عباس	صلعم نے کہ جس نے جان بوجھ کر
اذا حدّث قال اذا سمعتمونی	مجھ پر بہتان باندھا اس نے جہنم
احدّث عن رسول اللہ صلی اللہ	میں اپنا ٹھکانا بنایا۔ اور حضرت عبداللہ
علیہ وسلم فلم تجدوہ فی	ابن عباسؓ جب حدیث بیان کرتے
کتاب اللہ او حسناً عند الناس	تو کہتے کہ جب تم مجھے رسول اللہ صلی اللہ

فاعلموا انّی قد کذبت علیہ۔[8]

علیہ وسلم سے حدیث بیان کرتے سنو اور اسے نہ تو اللہ کی کتاب میں پاؤ نہ اسے لوگ مستحسن سمجھتے ہوں، تو جان لو کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر بہتان باندھا ہے۔"

(۵) ایک مشہور حدیث ہے جس سے امام ابو یوسف رحؒ نے کتاب "الرد علی سیر الاوزاعی" میں استفادہ کیا ہے اور ہم اپنے مضمون "تحریک حدیث" میں نقل کر چکے ہیں۔ اس کا مکرّر درج کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے بہ سند صحیح روایت کرتے ہیں :۔

ان الحدیث سیفشو اعنّی فما اتاکم عنّی یوافق القرآن فھو عنّی وما اتاکم عنّی یخالف القرآن فلیس عنّی۔

"عنقریب مجھ سے لوگ بہ کثرت احادیث روایت کریں گے تو جو حدیث میرے نام سے تم تک پہنچے، اگر وہ قرآن کے موافق ہے تو وہ یقیناً میری کہی ہوئی بات ہے اور جو اس کے خلاف ہے وہ میری حدیث نہیں۔"

بعد کے محدثین میں سے امام بیہقی رحؒ نے المدخل میں اور امام طبرانی رحؒ نے المعجم الکبیر میں اسی مضمون کی حدیثیں مختلف طریقوں سے روایت کی ہیں۔[9]

مندرجہ بالا تمام احادیث اس بات کی گواہ ہیں کہ خود محدثین کے نزدیک اہم بات احادیث کا عین قول یا فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہونا نہ تھا۔ بلکہ یہ امر تھا کہ آیا وہ قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عام تعلیمات کی روح کی حامل یعنی سنّتِ جاریہ کی مظہر ہیں یا نہیں۔ بنا بریں محدثین کی مساعی کو مطعون کرنا اپنی بے بصیرتی کا ثبوت دینا ہوگا۔ اسے "سازش" قرار دینا خود ایک سازشی فعل ہوگا۔ اور احادیث کی تاریخی صحت پر شک کرنے سے محدثین کے نفوسِ قدسیہ

کے بارے میں سوءِ ظن رکھنا ہرگز لازم نہیں آئے گا۔

تنقیح سوم: احادیث بالعموم تاریخی صحت سے محروم ہوتے ہوئے بھی سنت نبوی سے جدا ہرگز نہیں۔ حدیث اور سنت کے درمیان ایک گہرا اور ناقابل شکست رشتہ ہے۔ ہم اس سلسلۂ مضامین کی پہلی قسط میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ طبقۂ اول و دوم کے فقیہوں اور مفتیوں نے اور اربابِ سیاست اور اولوالامر نے امتِ مسلمہ کے مصالح کو مدنظر رکھتے ہوئے سنت نبوی کی تعبیر و توسیع کی تھی۔ اس طرح ہر طبقے کی یہ تعبیر، توسیع اس کے زمانے کی سنّتِ جاریہ تھی۔ اسی سنّتِ جاریہ نے جب الفاظ کا جامہ پہنا تو حدیث کی شکل میں نمودار ہوئی۔ یوں سنّتِ نبوی حدیث میں بھی اسی طرح جاری وساری ہے جس طرح وہ سنّتِ جاریہ پر جاری تھی۔ لیکن ذاتی اجتہاد اور علاقائی اجماع کے مسلسل عمل کی وجہ سے یہ سنّت جاریہ صرف سنت نبوی پر مشتمل نہ تھی بلکہ اس میں سنّتِ نبوی کی علاقائی مجتمع علیہ تعبیر کا عنصر بھی شامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ، کوفہ عراق وغیرہ کی اپنی الگ الگ سنّت جاریہ تھی۔ بالکل یہی صورت حدیثوں کی بھی ہے کہ ان میں علاقائی بنیاد پر اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا۔ کیونکہ احادیث سنّتِ جاریہ کی مظہر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ احادیث کا ایک نمایاں ترین پہلو ان کا باہمی تعارض ہے۔ اور بہ خصوصیت کہ تقریباً ہر امر کے بارے میں یہ مختلف نقطہ ہائے نظر کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس حقیقت سے جہاں احادیث کی تاریخی صحت مشکوک ہو جاتی ہے وہاں ان کا یہ وصف بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حدیثیں مختلف نقطہ ہائے نظر کی ترجمان ہونے کی وجہ سے امت مسلمہ کے سوادِ اعظم یعنی اہل السنت والجماعۃ کے باہم ہونے اور رواداری اختیار کرنے کا سب سے بڑا سبب بن گئیں۔ احادیث کے ذریعے اہل السنت نے درمیان کی راہ اختیار کرنے اور اعتدال پسندانہ امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان کی کوششیں بڑی حد تک مشکور ہوئیں۔ لیکن طبقۂ متقدمین کی سنّت جاریہ اور احادیث کی تشکیل کے عمل میں فرق بھی تھا۔ موضوع زیرِ بحث کے پیشِ نظر سب سے اہم فرق یہ تھا کہ جہاں سنّت جاریہ ایک زندہ اور ترقی پذیر عمل تھی وہاں حدیث ایک رسمی شے بن گئی۔ جس کے ذریعہ اسلام کی تقریباً پہلی تین صدیوں کی سنّت جاریہ کے آمیزہ (مرکّب شکل) کو ابدیتِ مطلقہ بخشنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تقاضائے وقت یہی تھا۔ کیونکہ ترقی پذیر عمل کی تشکیل لازمی ہے۔ اگر اسے کوئی

رسمی شکل نہ دی جائے تو خود اس عمل کے تسلسل کے ٹوٹنے کا خطرہ رہتا ہے کیونکہ تشکیل کے بغیر اس کی انفرادیت باقی نہیں رہتی۔ لیکن احادیث کی تدوین کا نتیجہ بالآخر محض تشکیل و تنظیم کی صورت میں نہیں بلکہ مکمل انجماد کی شکل میں نمودار ہوا۔ بلا شک و شبہ امتِ مسلمہ کی موجودہ مصلحتوں کا مقتضا یہ ہے کہ اس انجماد میں پھر سے حرکت پیدا کی جائے۔ سنتِ جاریہ کی روانی میں احادیث کے سدِ عظیم نے جہاں رکاوٹ پیدا کر دیا تھا وہاں سے "بوئے فساد" کو دور کر دیا جائے۔ لیکن یہیں آکر "ترقی پسند" گروہ رکاوٹ ڈالتا ہے۔ وہ یہ کہنے لگتا ہے کہ "حدیث و سنت یہ سب رجعت پسندی کے حربے ہیں۔ ان کی اصلاح ناممکن ہے۔ اگر آگے بڑھنا ہے تو انھیں پس پشت ڈال دو"۔ یہ صدائے یاس ہے یا پیامِ امید؟ اس سوال کا جواب سطورِ ذیل میں ملے گا۔

تنقیح چہارم: ہم نے بار بار یہ بات دہرائی ہے بلکہ اتنی بار کہ ہمارے بعض قاری ہم سے اکتا گئے ہوں گے کہ اگرچہ احادیث کی بنیاد آخرکار سنتِ نبوی پر ہے لیکن فی الواقع وہ مظہر ہیں سلفِ صالحین کی اس سنت کی جو رسول اللہ صلعم کی سنت کے سانچے میں ڈھلی تھی۔ درحقیقت بیشتر احادیث مجموعہ ہیں ان کہاوتوں جیسے مقولوں کا جن کی تراش خراش خود قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے ہاتھوں انجام پائی۔ مگر انھیں رسالتمآبؐ کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ یہ نسبت سراسر بے بنیاد نہ تھی۔ گرچہ ان مقولوں میں کہاوتوں کا اسلوب پایا جانا خود اس بات کی شہادت ہے کہ یہ نسبت تاریخی صحت سے محروم ہے۔ الغرض یہ احادیث ایک وسیع الذیل اور عظیم المرتبت شرح ہیں سیرتِ نبوی کی، جس کے شارح ہیں قرونِ اولیٰ کے مسلمان۔ چنانچہ سنتِ نبوی پر مبنی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ یہ سلفِ صالحین کے بصائر و حِکَم کا مجموعہ بھی ہیں۔

اب ہم ترقی کے نادان دوستوں کی نصیحت پر کان دھریں تو اس کے خطرناک نتائج نظر آتے ہیں۔ مثلاً اس سلسلۂ مضامین کی تیسری قسط "تحریک حدیث" میں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ اجماع کے بارے میں جو حدیثیں مروی ہیں ان کی تاریخی صحت ناقابلِ یقین ہے۔ اب اگر ہم ان دوستوں کے کہنے میں آجائیں تو ہمیں اجماع کے اصول سے ہاتھ دھولینا پڑے گا۔ ہمارے منکرِ حدیث ترقی پسند شاید یہ فرمائیں کہ اس اصول سے محرومی کی ضرورت نہیں کیونکہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا — اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور تفرقے

ٹکڑے نہ ہو جاؤ" (آل عمران آیت نمبر ۱۰۳)

مگر یہ آیت تو محض اتحاد کی دعوت دے رہی ہے نہ کہ اجماع کی جس کا مطلب ہے "کسی امر پر متفقہ فیصلے پر پہنچنا" اگر اس آیت سے اجماع کا اصول مستنبط ہو سکتا تو امام شافعیؒ وغیرہ اسے اجماع کی دلیل کے طور پر ضرور پیش کر چکے ہوتے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیں کہ اس آیت سے اجماع کا مفہوم نکلتا ہے تب بھی اس سے اجماع کی نوعیت کا تعین نہیں ہوتا۔ کیا یہ اجماع کمّ کا ہے یا کیف کا؟ یعنی یہ عددی ہے یا وصفی؟ یا بالفاظ دیگر یہ کلّی ہے یا اس میں اختلاف رائے کی گنجائش باقی رہتی ہے؟ ان سوالات کا جواب ہمیں احادیث ہی سے مل سکتا ہے۔ متعدد احادیث اس مضمون کی ہیں جن میں بعض میں صراحتاً اور بعض میں کنایتہً مخالف رائے کے اظہار کی ترغیب پائی جاتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اولاً ایک فیصلہ اجماع کو بعد کا اجماع بدل سکتا ہے۔ ثانیاً اجماع ایک رواجی امر ہے نہ کہ نظریاتی شے جس میں حق و باطل کی بحث ہو سکے۔ اجماع درست یا نادرست یا قدرے درست اور قدرے نادرست ہو سکتا ہے۔ اس کے حق یا ناحق ہونے کی بحث عبث ہے۔ امت دعویٰ عصمت نہیں کر سکتی جو وصف انبیاء ہے۔ اس کا فریضہ تو حق کی مسلسل تلاش، اس کا فہم اور اس پر عمل ہے۔ احادیث کا وصف حقیقی، ان کی امتزاجی نوعیت (synthesis) ہے۔ اجماع کی احادیث کو اگر ہم ان حقائق کی کسوٹی پر پرکھیں جن کی تاریخی صحت مسلّم ہے تو ہمیں پتہ چلے گا کہ ان احادیث کا سوتا سنّت نبوی ہی میں موجود ہے۔ رسول اللہ صلعم نے اپنی امّت کو نہ صرف مجتمع اور متحد رکھنے کی، بلکہ ان میں فکر اور مقصد کا اتحاد پیدا کرنے کی بھی ہر ممکن سعی فرمائی۔ قرآن نے اسی کو "شوریٰ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے احادیث کی یہ ابھی صفتی اور امتزاجی نوعیت صرف اجماع کی احادیث میں نہیں بلکہ اخلاقی، معاشرتی، قانونی اور سیاسی نظریات کے تقریباً تمام پہلوؤں پر مشتمل مضامین کی حدیثوں میں پائی جاتی ہیں ہم نے احادیث کے اس وصف کی وضاحت اس سلسلۂ مقالات کی گذشتہ قسط (حدیث اور اہل سنت والجماعت) میں پیش کی ہے۔

بہر کیف، اس حقیقت کی جس قدر تاکید کی جائے کم ہے کہ احادیث کے مختلف عناصر ترکیبی کی از سر نو جانچ پڑتال اور آج کل کے بدلے ہوئے معاشرتی اور اخلاقی ماحول کے

پس منظر میں ان کی تعبیر تو ضروری ہے ۔ یہ نئی جرح و تعدیل اور تعبیر و تشریح احادیث کے تاریخی تجزیئے کے بغیر ناممکن ہے ۔ یعنی ضرورت اس بات کی ہے کہ احادیث کو پھر سنّتِ جاریہ کا مقام بخشا جائے ۔ اور ان میں جو حقیقی عناصر ہیں انھیں ان آمیزشوں سے الگ کر لیا جائے ۔ جو وقتی مصالح کا نتیجہ تھیں ۔

اگر ہم نے مندرجہ بالا لائحۂ عمل اختیار کیا تو روایتی نقطۂ نظر کی حصر و تاکید کے توازن میں ترمیم کرنی پڑے گی مثلاً مسئلہ جبر و اختیار کو لیجئے ۔ امویوں کے ابتدائی دور میں اربابِ اقتدار کی طرف سے عقیدۂ جبر اختیار کرنے پر لوگوں کو مجبور کیا جا رہا تھا ۔ ایسی صورت میں عقیدۂ اختیار کی تاکید ضروری تھی چنانچہ حضرت حسن بصریؒ اور معتزلہ کے متقدمین کا یہی موقف تھا لیکن جب معتزلہ کی " انسان دوستی " (HUMANISM) حدِ غلو کو پہنچنے لگی اور اس سے خدا پرستی کی بنیادوں پر ضرب پڑنے لگی تو امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے رفقا نے معتزلہ کی عقلیت کے ردِ عمل کے طور پر مشیّت و قدرت الٰہی کی تاکید کو ضروری سمجھا ۔ اب قدرت و قدرِ الٰہی کے آگے انسان کے سراسر مجبور ہونے کا عقیدہ (القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ) تسنّن کا نشانِ امتیاز بن گیا ہے ۔ اس کا اصل مقصد تو فوت ہو چکا ہے بلکہ متاخرین فلاسفہ و صوفیا نے جب اس عقیدہ کی اور زیادہ غالیانہ تعبیریں رائج کر دیں تو اس سے امّتِ مسلمہ کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی کو سخت نقصان پہنچا ۔ اندریں حالات احادیث میں عقیدۂ اختیار کے مقابلے میں عقیدۂ جبر کی حمایت کا جو زور شور نظر آتا ہے اسے اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھتے ہوئے اس کی عملی مصلحت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے ۔ تاریخی تجزیہ و تعبیر کے اس اصول کا اطلاق دوسرے روحانی، اخلاقی اور معاشرتی مسائل پر مشتمل احادیث کے سلسلے میں بھی کرنا چاہیئے مثلاً شریعت اور طریقت کی صدیوں پرانی بحث میں ۔

تاریخی صورت حال کے پس منظر میں احادیث کی تعبیر یعنی اس کی حقیقی اخلاقی روح کو گذشتہ وقتی مصلحت کے کالبد سے الگ کر کے حیاتِ نو بخشنے کے اس اصول پر فقہی احادیث کے مسئلہ کو حل کرنا ضروری ہے ۔ فقہی احادیث میں ہمارے موجودہ مسائل کا بنا بنایا، تیار حل موجود نہیں کہ بس اس کے نفاذ کی دیر ہو ۔ یہ احادیث نئی جرح و تعدیل کی مقتضی ہیں ۔ یہ یقیناً بہت

نازک معاملہ ہے جس میں بغایت حزم و احتیاط کی ضرورت ہے مگر اس سے مفر ہرگز نہیں۔ اس کی ایک روشن مثال ربوا کا مسئلہ ہے۔ اس پر احادیث میں شدید معارضہ کی جو صورت نظر آتی ہے اسے ہم نے تاریخی ارتقا کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش اپنے مقالہ "تحقیق ربوا" میں کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ ان معارضوں اور ایک دوسرے کو جھٹلانے والی روایتوں کے باوجود ان میں بحیثیت مجموعی قرآنی تعلیم کی روح پائی جاتی ہے۔ اب ان کی لفظی اور رسمی پیروی کرنے بلکہ درحقیقت اس اتباع کا محض زبانی دعویٰ کرنے کی جگہ اس کے بنیادی اخلاقی اصولوں کو عملاً نافذ کرنا چاہیئے۔

ربوا کے سلسلے میں احادیث کی تاریخی نقطۂ نظر سے جرح و تعدیل کی جو ابتدائی ــــ اور مبتدیانہ ــــ کوشش ہم نے مذکورہ بالا مقالہ میں کی ہے۔ اس سے شاید یہ بات کسی حد تک واضح ہوئی ہو کہ حدیث کو سنت میں کیونکر تبدیل کیا جاسکتا ہے؛

احادیث کو ان کا اصلی مقام واپس کس طرح دلایا جاسکتا ہے؟ ان کے تاریخی تجزیہ و تعبیر کے ذریعہ ان کی اخلاقی قدروں کو حیات نو کس طرح بخشی جاسکتی ہے اور ان کی اس نئی زندگی سے امت مسلمہ کے عروق مردہ میں خون تازہ کس طرح پہنچایا جاسکتا ہے۔ اور مسلمانوں کے آج کے مسائل کس طرح حل کئے جاسکتے ہیں، یہ اعلیٰ وارفع مقاصد ہیں اگر ان کے حصول کی ایک جھلک بھی ہماری اس تحریر میں نظر آئی ہو تو ہم توفیق ایزدی کے شکر گذار ہیں۔ سبحانك لاعلم لنا الا ما علمتنا

اس سارے سلسلہ مضامین میں ایک بات ہمارے قارئین نے ضرور نوٹ کی ہوگی اور وہ یہ ہے کہ اگرچہ ہم مجموعی طور پر احادیث کی تاریخی صحت کو مشکوک جانتے ہیں لیکن ہم نے کہیں یہ نہیں کہا کہ یہ جھوٹی یا جعلی ہیں۔ اس لئے کہ اگرچہ صحیح احادیث کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ ان کے الفاظ و متن عین فرمودۂ رسولؐ ہیں بالعموم درست نہیں لیکن ان الفاظ کی روح یقیناً ترجمان سنتِ نبوی ہے۔ احادیث صحیحہ اکثر و بیشتر اس سنت کی تعبیرات اور اس روح کی تشکیلات ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے لئے "جعلی" کے لفظ کا استعمال خود ایک جعلسازی ہوگی۔ حدیث کو جعلی کیسے کہہ سکتے ہیں جب کہ وہ سنت جاریہ کی مظہر ہیں اور یہ سنت جاریہ خود کوئی جعلی شے نہیں بلکہ سنتِ نبوی کی نمو پذیر تعبیر اور جاندار تشکیل کی حقیقت ہے۔

بعض حسّاس مسلمانوں کے ذہن میں شاید یہ خلجان پیدا ہوا ہو کہ اگر سنت کے قول یا فعل رسول اللہ صلعم ہونے کی تاریخی صحت و تعین کے ساتھ تحدید و تعریف نہ ہوئی تو رسول اللہ صلعم اور امّتِ محمدیہ کے مابین تاریخی رشتہ کا سراغ گم ہو جائے گا۔ اور سنّتِ نبوی کا تصور سراسر باطل قرار پائے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ خلجان محض واہمہ ہے۔ اوّلاً دین کے بہت سے ارکان و اصول ایسے ہیں کہ جن کی ناقابلِ تردید تاریخی حیثیت مسلّم ہے۔ وہ یقیناً سنّتِ نبوی کا حصّہ ہیں۔ صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، حج وغیرہ کا اپنی عملی تفصیلات کے ساتھ بالتواتر بطور سنّتِ نبوی مروی ہونا ایسا بدیہی امر ہے کہ اس سے انکار وہی کر سکتا ہے جو عقل یا دیانت سے محروم ہو۔ علاوہ ازیں تاریخی احادیث یعنی وہ احادیث جن میں سیرتِ طیبہ بیان کی گئی ہے ان کے مہمات امور بالکل واضح اور شک وشبہ سے بالاتر ہیں۔ بلکہ فقہی اور کلامی حدیثوں کے لئے سیرتِ نبوی پر مشتمل یہ احادیث ہی معیار قرار پائیں گی۔ اور ان کی کسوٹی پر ہمیں فقہی و کلامی احادیث کو پرکھنا ہوگا کہ وہ کہاں تک رسول اللہ صلعم کی سیرت سے تطابق رکھتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نہ صرف رسول اللہ صلعم بلکہ آپ کے صحابہ کی سیرتوں کے ایسے واضح نقوش موجود ہیں جنھیں زمانہ کا ہاتھ دھندلا نہیں کر پایا ہے۔ صحابہ کی زندگیوں کے اہم واقعات و خصائص کے بارے میں قطعاً کسی شبہ کی گنجائش نہیں البتہ واقعات کی تفصیلات کے بارے میں اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم کی روشنی میں اور رسول اللہ صلعم اور آپ کے صحابہ کی سیرتوں کے بارے میں جو یقینی معلومات مہیا ہیں انکی ہدایت ہی وہ دو اصل ہیں جن کی پیروی میں ہم احادیث کی تعبیر کر سکتے ہیں۔ فقہی اور کلامی احادیث میں سے خالص نبوی عنصر کا سراغ لگانا مشکل ضرور ہے۔ بلکہ اس کا بتمامہ پتہ چلا لینا اس طرح کہ اس میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے محال ہے۔ لیکن مندرجہ بالا دو اصول کی رہنمائی میں ان میں سے کافی احادیث کے بارے میں یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس حد تک فی الواقع مرفوع ہیں۔

یہاں یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ ہم نے احادیث کو موجودہ حالات میں نافذ کرنے کے لئے انھیں حیات نو بخشنے کی جو تدبیر بتائی ہے اس کی رو سے فقہی اور کلامی احادیث پر تاریخی احادیث کو ترجیح مل رہی ہے۔ قرآن حکیم کے علاوہ تاریخی احادیث کو ہم نے معیار قرار دیا ہے حالانکہ اس بارے میں روایتی اندازِ فکر اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ صحیح ہے کہ روایات فقہی اور کلامی احادیث کی حمایت میں ہیں لیکن اس امر کی تائید میں حقیقی دلیل کوئی نہیں، اور اس کی تردید میں بکثرت شواہد

موجود ہیں۔ جو ہم نے اس سلسلۂ مضامین میں پیش کئے ہیں۔ تاریخی احادیث سے تعصب برتنے کی ایک واضح مثال عام محدثین کا محمد بن اسحاق کو غیر ثقہ راوی قرار دینا ہے (حالانکہ سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے قدیم ماخذ انھیں کی کتاب ہے) اس کے بارے میں امام مالکؒ کا جو قول بیان کیا جاتا ہے وہ غالباً بعد کے محدثوں کی اپنی ذاتی رائے ہے۔ ہمیں یہ شبہ اس لئے ہے کہ اگر طبقۂ متقدمین کے محدثین وفقہا انھیں غیر ثقہ سمجھتے تو امام ابویوسفؒ ان سے الرد علی سیر الاوزاعی میں اتنی حدیثیں روایت نہ کرتے[۱۰]

وآخر دعوینا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین۔

حواشی اور حوالے

(۱) معتزلہ کے سلسلے میں ملاحظہ ہو کتاب الامّ از امام شافعیؒ جلد ہفتم، صفحہ ۲۵۲ سطر ۱۵۔ (مطبوعہ بولاق، ۱۳۲۱ھ) خوارج کے سنّت کو قبول کرنے کے بارے میں ملاحظہ ہو خارجی (اباضیہ) قائد ابوحمزہ کی تقریر۔ کتاب البیان والتبیین از جاحظ ج ۲، ص ۱۲۳، سطر ۱۳ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۴۸ء خوارج میں سے بعض احادیث کے بھی قائل تھے، ملاحظہ ہو تاویل مختلف الحدیث از ابن قتیبہ ص ۳ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۶ھ۔

(۲) اسناد پر دو نامور مستشرقین کائتانی اور شاخت کی بحثیں قابل توجہ ہیں۔ ملاحظہ ہو

L. CAETANI, <u>ANNALI DEL L'ISLAM</u>

J. SCHAHT, <u>ORIGINS OF MUSLIM JURISPRUDENCE</u>

۳۔ مجمع الزوائد از نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی ج ۱ ص ۱۵۴، قاہرہ ۱۳۵۲ھ و مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۲۱، ۱۳۱۳ھ
۴۔ الجامع الصغیر از امام سیوطی ج ۱ ص ۲۹، مصر ۱۹۵۴ء
۵۔ مشکل الآثار از امام طحاوی ج ۱ ص ۱۷۴ تا ۱۷۶ حیدر آباد دکن ۱۳۳۳ھ
۶۔ شرح صحیح المسلم از امام نووی ج ۱ ص ۸، کراچی ۱۳۴۹ھ
۷۔ ایضاً
۸۔ سنن الدارمی ج ۱ ص ۱۲۶، دمشق ۱۳۴۹ھ
۹۔ الرد علی سیر الاوزاعی از امام ابویوسف۔ ص ۲۵ و حاشیہ۔ حیدر آباد تاریخ ندارد
۱۰۔ ایضاً، ص ۸، ص ۱۲ وغیرہ